> **فریاد** آزر ایک عرصے تک مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ٹیچنگ سے سبکدوشی کے بعد بھی بحیثیت شاعر متحرک رہے۔ نئی دہلی سے شائع ہونے والے 'اردو میڈیا' میں مدیر اعزازی رہے جبکہ 'ادب عالیہ' اپنی ادارت میں شائع کیا کرتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے 'خزاں میرا موسم' (1994) اور 'قسطوں میں گزرتی زندگی' (2005) کافی مقبول ہوئے۔

ایک مقبول شاعر تھے
فریاد آزر

فریاد آزر ایک اچھے اور مقبول شاعر تھے۔ کئی شعرا پوری زندگی شاعری کرتے ہیں اور ان کا ایک شعر زبان زد عام و خاص نہیں ہو پاتا جبکہ فریاد آزر کے کئی اشعار زبان زد عام و خاص ہیں۔ ان کے ادبی قد، کام اور ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہی کئی ادبی رسائل نے ان پر گوشے شائع کیے۔ فریاد آزر کی پیدائش 10 جولائی، 1956 کو بنارس میں ہوئی تھی۔ دہلی میں وہ ایک عرصے تک مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ٹیچنگ سے سبکدوشی کے بعد بھی بحیثیت شاعر متحرک رہے۔ نئی دہلی سے شائع ہونے والے 'اردو میڈیا' میں مدیر اعزازی رہے جبکہ 'ادب عالیہ' اپنی ادارت میں شائع کیا کرتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے 'خزاں میرا موسم (1994)' اور 'قسطوں میں گزرتی زندگی (2005)' کافی مقبول ہوئے۔ یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ 12 اپریل، 2024 کو فریاد آزر کے انتقال کے ساتھ اردو نے ایک اچھے شاعر کو کھو دیا ہے۔ فریاد آزر کے مقبول اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

ادا ہوا نہ قرض اور وجود ختم ہو گیا
میں زندگی کا دیتے دیتے سود ختم ہو گیا

☆

نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے

☆

ایسی خوشیاں تو کتابوں میں ملیں گی شاید
ختم اب گھر کا تصور ہے مکاں باقی ہے

☆

بند ہو جاتا ہے کوزے میں کبھی دریا بھی
اور کبھی قطرہ سمندر میں بدل جاتا ہے

☆

جو دور رہ کے اڑاتا رہا مذاق مرا
قریب آیا تو رویا گلے لگا کے مجھے

☆

صبح ہوتی ہے تو دفتر میں بدل جاتا ہے
یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے

☆

میں اس کی باتوں میں غم اپنا بھول جاتا مگر
وہ شخص رونے لگا خود ہنسا ہنسا کے مجھے

☆

اس تماشے کا سبب ورنہ کہاں باقی ہے
اب بھی کچھ لوگ ہیں زندہ کہ جہاں باقی ہے

☆

میں جس میں رہ نہ سکا جی حضوریوں کے سبب
یہ آدمی ہے اسی کامیاب موسم کا

☆

ہم ابتدا ہی میں پہنچے تھے انتہا کو کبھی
اب انتہا میں بھی ہیں ابتدا سے لپٹے ہوئے

☆

خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
خوب سیرت لڑکیاں سب ہاتھ ملتی رہ گئیں

☆

میں اپنی روح لیے در بہ در بھٹکتا رہا
بدن سے دور مکمل وجود تھا میرا

سہارا تبصرہ

نام کتاب : **چیونٹیوں کے درمیاں**
مصنف : **اقبال نیازی**
صفحات : 192، قیمت: 200 روپے
رابطہ : 5/14، ایل آئی جی کالونی، ونوبا بھاوے نگر، کرلا (ویسٹ)، ممبئی-400070
موبائل : 9323186007
تبصرہ نگار : **خاور حسن**

'چیونٹیوں کے درمیاں' مشہور ڈرامہ نگار اقبال نیازی کے افسانچوں اور مختصر کہانیوں کی کتاب ہے۔ ان کے افسانچوں یا مختصر کہانیوں کو پڑھتے ہوئے شروع میں یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ اختتام کیا ہوگا۔ مثال کے طور پر 'چلو انتظار کرتے ہیں!' دیکھیے- ایک مشہور فلمی رائٹر کی موت کی خبر اردو اور انگریزی اخبارات اور رسائل میں چھپوانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ آخری رسومات کی تیاریاں بھی کر لی گئی ہیں۔ آخری رسومات میں شرکت کے لیے معزز شخصیات کو خبر کر دی گئی ہے۔ ٹی وی چینل والوں کو آنے کے لیے کہہ دیا گیا ہے۔ آنجہانی کے بیٹوں نے ماں کو تیار ہونے کے لیے کہہ دیا ہے- یہاں تک کہانی عام سی لگتی ہے مگر اس کے بعد کہانی چونکاتی ہی نہیں، جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے جب بڑا بیٹا اداس چہرے سے اصل پریشانی کی وجہ بتاتے ہوئے کہتا ہے، 'ڈیڈی نے ابھی آخری سانس نہیں لی ہے، انکل!...انتظار تو کرنا ہی پڑے گا... بس دعا کریے کہ جلدی سے جلدی اس ٹینشن سے نجات ملے۔' یعنی بیٹوں نے باپ کے مرنے کے بعد کی ساری تیاریاں کر لی ہیں اور 'ٹینشن' کی بات یہ ہے کہ باپ زندہ ہے۔

اقبال نیازی نے دیگر افسانچوں اور مختصر کہانیوں میں بھی چونکایا ہے۔ قارئین کو مجبور کیا ہے، وہ جو کہانی رواروی میں پڑھ رہے تھے، پھر شروع سے پڑھیں تا کہ کلائمکس بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ 'مرجھائے ہوئے خواب' کی نمرتا کو پروڈیوسر پریمانند ڈکشن اور ٹون سدھارنے کے لیے تیار کر لیتا ہے۔ سدھار ورکشاپ کے تین چار مہینے میں اسے 16 لوگوں کے بستر پر بچھنا پڑتا ہے، کئی بار مانع حمل کی گولیاں کھانی پڑتی ہیں، کئی بار ابارشن کرانا پڑتا ہے۔ نمرتا یہ سب کرتی چلی جاتی ہے کہ 'اس انڈسٹری میں لوگ کامیابی کے پیچھے کی ''قیمت'' نہیں پوچھتے بلکہ سامنے کی کامیابی کی ''قیمت'' ادا کرتے ہیں، عزت کے ساتھ۔' مگر ایک دن اس کے 'سپنے اس کی آنکھوں میں ہی دم توڑ دیتے ہیں۔' اسے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے، 'سب کچھ سدھر گیا۔ بس میں بگڑ گئی، برباد ہو گئی۔' اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، 'اپنا کردار کیسے سدھرے گا؟' یہ کہانی نمرتا کی خودکشی کی خبر پر ختم ہوتی ہے۔

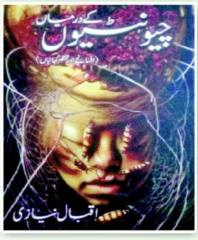

اقبال نیازی چار دہائی سے زیادہ عرصے سے ڈراموں سے وابستہ ہیں۔ وہ ڈرامے لکھتے ہیں، اسٹیج بھی کراتے ہیں۔ ڈرامے کی دنیا کے لوگ ان کا نام احترام سے لیتے ہیں لیکن افسانچہ نگاری کے میدان میں بھی وہ نئے نہیں ہیں۔ چار دہائی قبل سے افسانچے لکھ رہے ہیں۔ ان کا افسانچہ 'روزی روٹی' 1982 میں فلمی رسالہ 'روبی' میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانچہ اس کتاب میں شامل ہے اور آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ آج بھی نہایت ہی مجبوری میں جسم کا سودا کرنے والی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے نام روزی کے بجائے کچھ اور ہو سکتے ہیں مگر حالات سے وہ اسی طرح پریشان ہیں جیسے روزی۔ اس کے 'گھر کے خالی ڈبوں میں تسلیاں بھی نہیں بچی ہیں،' ماں اور دونوں بھائی بھوکے ہیں۔ اسی لیے ایک بڑی کمپنی کے باس کے لجلجے زانو پر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ باس کہتا ہے، 'تمہارا نام روزی ہے نا ہے؟' وہ سر جھکا کر کہتی ہے، 'یس سر روزی۔' اور پھر باس کے پوچھنے پر کہ میرا نام کیا ہے، وہ کہتی ہے، 'روٹی...!!'

اقبال نیازی کی کتاب 'چیونٹیوں کے درمیاں' میں 102 افسانچے اور مختصر کہانیاں ہیں۔ ان افسانچوں اور مختصر کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال نیازی نے ڈراموں میں اپنی مہارت کا افسانچہ نگاری میں خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ 'اقبال نیازی کے وہ افسانچے جن میں ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں، وہ اقبال نیازی کی انفرادیت ہے۔ یوں تو کچھ نہ کچھ ڈرامائیت تو آپ کو دیگر افسانچہ نگاروں کے افسانچوں میں بھی مل جائے گی لیکن ڈرامے کے نشیب وفراز اور باریکیوں سے جس طرح اقبال نیازی واقف ہیں وہ کسی ایسے ہی افسانچہ نگار کے یہاں ملے گا جو ڈرامے کے فن سے واقف ہو اور عملی طور پر ڈرامے سے منسلک ہو۔' اقبال نیازی نے اچھے مکالمے لکھے ہیں۔ مثلاً: تیرے خواب قطرہ قطرہ پگھل کر تیرے محبوب کے خوابوں میں ضم ہو گئے ہیں (معبر! خوابوں کی چوری ہو گئی)، کماٹی پورہ کی رنڈی اور شیئر مارکیٹ کی منڈی میں کوئی فرق نہیں۔ کبھی بھی اچھال آتا اور کبھی بھی ایکدم نیچو۔' (کماٹی پورہ ایک مونولاگ)، 'دکھ، درد، غم صابرہ! میرے ماں باپ نے آخر کہاں چھپا رکھے تھے ہماری نظروں سے بچا کر؟ آؤ ڈھونڈتے ہیں۔' (بزرگوں کا لاکر)۔ عذرا علیم کے مطابق، '(اقبال نیازی کے) تخلیق کردہ ہر افسانچے کا عنوان گو کہ مختلف ہے مگر تمام کہانیاں روزمرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات...انسانی ذہن کی ریشہ دوانیوں پر مشتمل ہیں جو بنت حوا اور ابن آدم کے ارد گرد گھومتی ہیں بالخصوص معاشرے میں عورت کے کسی بھی روپ میں اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم پر احتجاج کر رہی ہیں...اقبال نیازی نے اپنے افسانچوں میں ماحول کی عکاسی کے لیے کہیں کہیں منٹو کے بے باک انداز تحریر کو اپنایا ہے۔' ڈاکٹر یاسمین اختر کے الفاظ میں کہیں تو اقبال نیازی کے افسانچوں اور مختصر کہانیوں میں 'زبان کی برجستگی، فکری گہرائی، تخلیقی بصیرت اور جذباتی تنوع' ہے۔ اسی لیے ان کے افسانچوں اور مختصر کہانیوں کو پڑھتے ہوئے بوریت نہیں ہوتی۔ 8 کتابوں کے مصنف اقبال نیازی کی 6 کتابیں جلد ہی شائع ہونے والی ہیں۔ ان کی اس کتاب 'چیونٹیوں کے درمیاں' کے چرچے یوں ہی نہیں ہیں۔ یہ واقعی قابل مطالعہ ہے۔ ■

حسرت موہانی

مقبول شاعر
مشہور غزل

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت جاں
کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا

ان کو یاں وعدے پہ آلینے دے اے ابر بہار
جس قدر چاہنا پھر بعد میں برسا کرنا

شام ہو یا کہ سحر یاد انہیں کی رکھنی
دن ہو یا رات ہمیں ذکر انہیں کا کرنا

صوم زاہد کو مبارک رہے عابد کو صلوٰۃ
عاصیوں کو تری رحمت پہ بھروسا کرنا

عاشقو! حسن جفاکار کا شکوہ ہے گناہ
تم خبردار خبردار نہ ایسا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت
ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

ہم رہ گئے اکیلے

سیفی سرونجی

روز کی طرح آج بھی چاندنی بالائی منزل کی چھت پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جانے کیا بات تھی اس کی آواز میں...اور جانے کتنا جادو تھا۔ وہ اس کی آواز سن کر کھو سی جاتی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں وہ ہمیشہ ایک ہی گیت گنگنایا کرتا تھا:

او دور کے مسافر...ہم کو بھی ساتھ لے لے
...ہم رہ گئے اکیلے

اس کی آواز سنتے ہی چاندنی ہر کام چھوڑ کر چھت پر آجایا کرتی تھی۔ کتنا درد ہے اس کی آواز میں...وہ اس گیت کے اختتام پر چھت پر بیٹھی گھنٹوں سوچا کرتی، 'کاش! وہ سدا اسی طرح گاتا رہے اور میں خاموش بیٹھی سنتی رہوں۔ کتنی کشش ہے اس کی آواز میں...لیکن وہ ہمیشہ ایک ہی گیت کیوں گاتا ہے؟'

کتنی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اس کی وجہ معلوم کرے۔ اس کے پاس جائے، اس سے پوچھے، 'تجھے کیا غم ہے؟...تو ہمیشہ ایک ہی گیت کیوں گاتا ہے؟...کیا تجھے کسی سے پیار ہو گیا تھا؟...کیا اس نے تجھے دھوکا دیا؟' اسی طرح سیکڑوں سوالات اسے پریشان کرتے رہتے۔ کئی بار وہ اس کے دروازے تک گئی لیکن ہمت جواب دے گئی اور وہ لوٹ آئی۔

اس نے جب سے اشوک کی آواز سنی تھی، اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ رات کے دس بجتے ہی تمام کاموں سے فارغ ہو کر چھت پر پہنچ جاتی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ دن میں بھی سارے کام چھوڑ چھاڑ کر چھت پر جا بیٹھتی اور اس کے تصور میں کھوئی رہتی۔ وہ خود بھی تنہائی میں اکثر وہی گیت گنگنایا کرتی، 'اف! کتنا درد ہے۔' وہ اپنے آپ سے باتیں کیا کرتی اور جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو خود کو مختلف قسم کے مشاغل میں الجھا کر دل بہلانے کی ناکام کوشش کرتی۔

اشوک کو پڑوس کے مکان میں آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب اشوک نے یہ گیت نہ گنگنایا ہو۔

رفتہ رفتہ چاندنی کو معلوم ہو گیا کہ اشوک ایک انتہائی ستم رسیدہ اور زمانے کا ٹھکرایا ہوا بدنصیب انسان ہے۔ اس سے جو دردناک ٹریجڈی وابستہ تھی، اسے سن کر چاندنی تڑپ اٹھی۔ اس کا دل اشوک کے لیے رحم اور ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا اور پھر دھیرے دھیرے یہ جذبات اس کے رگ و پے میں محبت بن کر دوڑنے لگے۔

اشوک قریب کے کسی گاؤں کا رہنے والا ایک غریب کسان کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن گاؤں کے مکھیا کی حسین ترین لڑکی آشا کو دل دے بیٹھا تھا۔ آشا بھی اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ اشوک کی آواز میں وہ جادو تھا کہ جو ایک بار سن لیتا وہ اس کا دیوانہ ہو جاتا۔ وہ صبح شام گاؤں کے قریب بہنے والی ندی کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر بیٹھ کر اپنی آواز کا جادو جگایا کرتا تھا۔ ایک روز آشا بھی ادھر آنکلی اور اشوک کا گیت سن کر دل و جان سے اس پر فدا ہو گئی۔ اشوک کی خشک اور خزاں رسیدہ زندگی میں جیسے بہار آ گئی۔ اس کے گیتوں کو جس ساز کی ضرورت تھی، وہ اسے مل گیا۔ اس کے نغمات میں ایک نئی جان آ گئی۔ وہ آشا کو پا کر خود کو دنیا کا بے حد خوش قسمت انسان سمجھنے لگا۔ دونوں روز ندی کنارے ملتے اور محبت کے نغمے گنگناتے۔ آشا ہمیشہ اشوک سے بس ایک ہی گیت کی فرمائش کرتی، 'او دور کے مسافر...ہم رہ گئے اکیلے۔'

جانے کیا بات تھی کہ آشا کو یہ گیت بہت پسند تھا۔ جب بھی اشوک یہ گیت گاتا، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ جب تک وہ گیت گاتا رہتا، آشا کھوئی کھوئی سی رہتی اور گیت ختم ہوتے ہی وہ اشوک کی آغوش میں سمٹ جاتی، 'اشوک، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی...اگر تم مجھے نہ ملے تو بھگوان کی سوگندھ میں اسی ندی میں کود کر جان دے دوں گی۔'

اشوک اسے یقین دلاتا، 'نہیں آشا!...ایسا مت سوچو۔ اگر تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میرا کیا ہوگا؟...اس بھری دنیا میں ایک تم ہی تو میرا سہارا ہو۔ صرف تم ہی تو ہو جو میری اپنی ہو۔ جب تم ہی میرا ساتھ چھوڑ دوگی تو میں پھر کس کے سہارے زندہ رہوں گا؟...آشا، تم ایسا مت سوچو...ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ ہم ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ مریں گے۔'

دن گزرتے رہے۔ محبت پروان چڑھتی رہی لیکن محبت کی خوشبو ایک دن پھوٹ گئی...اور پھر رفتہ رفتہ سارے گاؤں میں ان کی محبت کا فسانہ زبان زد عام ہو گیا۔ آشا کے باپ کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی تو وہ برداشت نہ کر سکا کہ ایک غریب کسان کا مفلس لڑکا اس کی لڑکی کی آرزو کرے۔ زمیندار اشوک کا جانی دشمن ہو گیا اور موقع کی تاک میں رہنے لگا۔

اشوک اور آشا نے جو سنہرے سپنے سجائے تھے، وہ یکلخت ٹوٹ گئے۔ انہوں نے تصورات میں محبت کے جو حسین محل تعمیر کیے تھے، وہ چکنا چور ہو گئے۔ اشوک کی دنیا ویران ہو گئی۔

ظالم سماج نے اس کی محبت کو اس سے چھین لیا۔ وہ آشا جس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری اور بے کیف تھی، اس کی ہر سانس آشا کے لیے تھی، وہ صرف آشا کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ آشا کی جدائی نے اس کو توڑ کر رکھ دیا۔ آشا کی جدائی میں وہ سودائی ہو گیا اور دیوانوں کی طرح ادھر ادھر پھرنے لگا۔ مکھیا نے اس کو زر خرید غنڈوں سے پٹوا کر گاؤں سے نکال دیا لیکن وہ اپنی آشا کو چھوڑ کر جاتا بھی کہاں؟

ادھر آشا کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے پریتم اشوک کے ساتھ یہ ظلم دیکھ کر تڑپ رہی تھی لیکن بے بس تھی۔ کیا کر سکتی تھی۔ مجبور اور محصور تھی۔ وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں ایک قیدی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کا گھر سے باہر آنا جانا بالکل بند تھا اور سختی سے اس کی نگرانی ہو رہی تھی۔

کئی روز بعد اشوک ندی کے اس پار آیا اور اپنی پر درد آواز میں وہی گیت فضاؤں میں بکھیرنے لگا۔ گیت کی صدا جیسے ہی آشا کے کانوں سے ٹکرائی، وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کا ظالم باپ اس وقت گھر پر موجود نہ تھا۔ آشا کسی طرح سب کی نظروں سے بچ کر گھر سے نکل بھاگی اور ندی کے کنارے پہنچ کر اشوک سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

'اشوک! مجھے یہاں سے لے چلو کہیں دور...بہت دور! اس ظالم سماج کے چنگل سے مجھے چھڑا لو!...ورنہ میں زندہ نہیں رہوں گی۔'

اشوک ابھی خود کو ٹھیک طور سے سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ زمیندار گاؤں کے بہت سے لوگوں کے ساتھ وہاں آ گیا اور اشوک کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اشارہ ملتے ہی زمیندار کے لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ آشا سے یہ ہولناک منظر دیکھا نہ گیا۔ وہ بری طرح چیخنے لگی۔ 'بھگوان کے لیے اسے چھوڑ دو...ظالمو! میری جان لے لو لیکن اشوک کو چھوڑ دو۔'

آشا کی فریاد کسی نے نہیں سنی۔ اشوک مار کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اسے مردہ سمجھ کر زمیندار نے ندی میں پھکوا دیا۔ اسی ہنگامے میں موقع پاتے ہی آشا نے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنے قول کی پکی نکلی اور اشوک کے بغیر زندہ نہ رہ سکی لیکن اشوک معجزانہ طور پر بچ گیا اور آج ایک سال سے شہر میں اس طرح زندگی گزار رہا تھا کہ دیکھنے والے اس کو ایک نیم دیوانہ سمجھتے تھے۔

اب اشوک کا صرف ایک ہی کام تھا- ہر رات اپنی آشا کو پکار پکار کر اس کا پسندیدہ گیت گانا:

'او دور کے مسافر...ہم رہ گئے اکیلے۔'

جس وقت سے چاندنی نے اشوک کی پر درد داستان سنی تھی، وہ اسے بے پناہ چاہنے لگی تھی۔

آج صبح سے ہی اس کے دل پر عجیب قسم کی گھبراہٹ طاری تھی۔ اشوک کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ منتظر تھی کہ اشوک آئے تو اس کا درد بھرا گیت سنے۔ رات کے دس بج گئے لیکن خلاف معمول اشوک کے مکان پر خاموشی طاری تھی۔ چاندنی چھت پر کھڑی بے چینی سی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

'نہ جانے کیوں آج اشوک ابھی تک نہیں آیا؟...' اس کو عجیب قسم کے خدشات پریشان کر رہے تھے۔

'کیا آج وہ نہیں آئے گا؟...کیا اس کی آشا اسے مل گئی؟...آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔' ابھی انہیں خیالات میں غرق تھی کہ اشوک کے گھر سے چند مبہم سی آوازیں اس کے کان سے ٹکرائیں۔ کوئی کہہ رہا تھا، 'اشوک نے زہر کھا لیا...'

چاندنی پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ دیر تک چھت پر ساکت و صامت کھڑی رہی۔ دور کہیں سے ریڈیو کی آواز آ رہی تھی۔ محمد رفیع اپنی پرسوز آواز میں نغمہ سرا تھے، 'او دور کے مسافر...ہم کو بھی ساتھ لے لے...ہم رہ گئے اکیلے۔' ■

2 شاعر 2 غزلیں

دیکھنا، اس کا اشارہ دیکھنا
کر گیا دل پارہ پارہ دیکھنا
عید میں بھی پانی پانی کر گیا
ٹھنڈی نظروں سے تمہارا دیکھنا
پھر قلم اس کا قصیدے میں مگن
پھر نوازے گا ادارہ دیکھنا
بعد رمضاں پھر کہیں بھوکے نہ ہوں
تھا پڑوسی کو دوبارہ دیکھنا
میم سرور کی غزل میں ہے کہاں
فکر نو کا استعارہ دیکھنا!

م سرورؔ پنڈولوی
Station Road, Rose Study Circle,
Pandaul, Madhubani-847234

جب بھی اس کی یاد آئی
کتنے لمحے ساتھ لائی
ہیں مصائب تو ازل سے
کب نجات انساں نے پائی
اک رہے محروم ہم ہی
اے خدا تیری خدائی
ہر قدم پر ہیں خدا یاں
جتنے ہیں اتنی خدائی
تھے سلیمؔ اس درجہ بے بس
پا کے خود منزل گنوائی

محمد سلیمؔ
Nalasopara(W), Vasai,
Palghar-401203